

قائد اعظم محمد علی جناح کی سحر انگیز شخصیت

ڈاکٹر ایوب ندیم

Dr. Ayub Nadeem

Associate Professor, Department of Urdu,

Govt. College of Science, Wahdat Road, Lahore.

Abstract:

Quaid-i-Azam had an impressive personality. Nobody could make a question on his honesty, truthfulness, wisdom and straightforwardness. He was the Man of Principles. He had clarity in his mind towards his object. He had displayed the case of Pakistan on both sides, publically and legally. When we compare Quaid-i-Azam and Gandhi, the personality of Quaid comes with perfection.

قائد اعظم محمد علی جناح ایک سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ تعلیمی دور سے وکالت تک، وکالت سے سیاست تک اور سیاست سے قیادت تک، انھوں نے اپنے شخصی اوصاف سے ایک جہان کو متاثر کیا۔ مسلمانانِ برصغیر تو ان کے شخصیت کے گرویدہ ہو گئے، دیگر مذاہب کے بھی کئی معتبر افراد ان کے اعلیٰ خصائص کو جانتے اور مانتے تھے۔ انھیں مسلم لیگ سے باہر بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پروفیسر مظفر مرزا کی تصنیف ”قائد اعظم اور گاندھی“ نہ صرف ان کے ان اوصاف کا احاطہ کرتی ہے، بل کہ ان کے مد مقابل سیاسی رہنما گاندھی جی کے عادات و اطوار کو بھی سامنے لاتی ہے۔ گویا یہ تصنیف برصغیر کے دو ایسے نامور سیاسی رہنماؤں کے تقابل پر مشتمل ہے، جو تحریک آزادی کے فیصلہ کن زمانے میں برصغیر کے سیاسی منظر نامے پر سب سے نمایاں تھے۔ یہ تصنیف قائد اعظم اور تحریک پاکستان سے ان کی والہانہ محبت کی مظہر ہے۔ قائد اعظم کی پُر اثر شخصیت کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

”حضرت قائد اعظم خدا تعالیٰ کی ایک شاہکار تخلیق تھے۔ اگر دنیا

کے سیاسی قائدین کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو حضرت قائد اعظم

سب سے بلند اور ارفع و اعلیٰ مقام کے مالک نظر آئیں گے۔ انھوں

نے ایک خاص مقصدِ حیات کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں اوقوتیں

پابند ضوابط رکھیں۔“ (۱)

قائد اعظم کے بارے میں تو قریباً ہر تعلیم یافتہ پاکستانی جانتا ہے کہ اُن کا اصل نام محمد علی جناح ہے۔ وہ ۱۸۸۶ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں ہی حاصل کی، پھر انگلستان چلے گئے، جہاں سے انھوں نے ”بار ایٹ لاء“ کیا۔ وطن واپس آ کر وکالت کو بطور پریشہ اختیار کیا اور بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ پہلے کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرم رہے، بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ مسلمانان ہند کی آزادی کی جدوجہد کو بام عروج تک پہنچایا۔ اُنہی کے قیادت میں قیام پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے اور ۱۹۴۸ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ لیکن گاندھی جی کے بارے میں معلومات ہمیں اکثر منتشر صورت میں ملتی ہیں۔ گاندھی کا اصل نام موہن داس کرم چند تھا۔ وہ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم لندن سے حاصل کی اور وہیں سے ۱۸۸۹ء میں بار ایٹ لاء کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۰ء تک قریباً سات سال جنوبی افریقہ میں رہے۔ ۱۹۰۵ء میں مغربی لباس ترک کر کے پہلے تہمند، کرتا اور پگڑی اور پھر لنگوٹ کو اپنا پیرہن بنایا۔ ہندوستان واپس آ کر آل انڈیائی نیشنل کانگریس کی قیادت کی، کئی بار جیل گئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک ہندو مرہٹے نے انھیں گولی مار کر قتل کر دیا۔

قائد اعظم اور گاندھی کی شخصیتوں میں امتیازات اپنی جگہ، تاہم ان کے حالات زندگی میں کئی اشتراکات بھی ملتے ہیں، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ مظفر مرزا لکھتے ہیں:

”گاندھی عمر میں حضرت قائد اعظم سے سات برس بڑے تھے۔ ان دونوں شخصیات کی مادری زبان گجراتی تھی۔ گاندھی کا خاندان پور بند سے بعد میں راج کوٹ منتقل ہوا اور حضرت قائد اعظم کا خاندان راج کوٹ سے کراچی منتقل ہوا، جہاں ان کے والد جناح پونجانی چڑے کے کاروبار میں دل چسپی لینا شروع کی۔۔۔ یہ قدرت کا کرشمہ تصور کیا جائے یا حسن اتفاق کہ گاندھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد راج کوٹ سے بمبئی پہنچے اور قائد اعظم انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی سے بمبئی پہنچے اور خدا تعالیٰ نے برصغیر کی دونوں شخصیات کو بمبئی ہائی کورٹ میں پریکٹس کے لیے آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔“ (۲)

گاندھی جب اپنی تعلیم مکمل کر چکے تو انہیں برطانوی حکومت کی طرف سے ریکرونگ ایجنٹ کی حیثیت سے جنوبی افریقہ بھیجا گیا تھا، جب واپس ہندوستان آئے تو سماجی خدمت میں مصروف ہو گئے جس پر انھیں حکومت برطانیہ کی جانب سے جنگی تمغے سے نوازا گیا۔ انھیں یہ تمغہ کس خدمت پر دیا گیا۔ اس ضمن میں بھارتی مصنف بی سین گیتا (B. Sengupta) اپنی کتاب ”Mahatama Gandhi and

india's struggle for sworaj“ میں لکھتے ہیں:

”برطانوی سلطنت کو ۱۸۹۹ء میں بانرگا چیلنج درپیش تھا۔ چنانچہ گاندھی نے والٹئیر ایبولینس کو رتیار کی۔ اس کی وجہ سے ان کی خدمات کی تمام اخبارات میں تشہیر ہوئی اور پھر اسی خدمت کے صلے میں انھیں جنگی تمغہ بھی حاصل ہوا۔“ (۳)

ایک قومی قائد کے لیے جن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، ان میں سچائی، خلوص، دیانت داری، تدبیر و فراست، عزم و استقلال اور سیاسی بصیرت خاص طور سے اہم ہیں۔ پروفیسر مظفر مرزا نے ان جملہ خصائص کا ایک ایک کر کے تجزیہ نہیں لیا، تاہم ان میں سے بعض خصوصیات کے حوالے سے دونوں رہنماؤں کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی بات کے حق میں امثلہ بھی پیش کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قائد اعظم کے ایک عقیدت مند کے طور پر ان کا جھکاؤ اپنے قائد کی طرف ہے اور بعض مقامات پر گاندھی کے بارے میں بعض قدرے غیر ضروری امور اور واقعات بھی زیر بحث آ گئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر انہوں نے تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ قائد اعظم ایک وسیع الذہن اور وسیع القلب مسلمان تھے، فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کو ناپسند کرتے تھے، وہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی مسلک یعنی دین اسلام کا پیرو کار سمجھتے تھے اور سب کو متحد دیکھنا چاہتے تھے، جب کہ ہندوؤں میں ذات پات کی وجہ سے اونچ نیچ کا نظام قائم ہے۔ برہمن اور اچھوت میں بڑا بعد ہے۔ گاندھی جی خود کو اہمسا کا اوتار قرار دیتے تھے اور برہمن کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے ان کا خیال تھا کہ اچھوتوں کو حقیقی ہندو ازم سے دور رکھنا چاہیے۔ یہ مسئلہ محض گاندھی کا نہیں تھا، پوری ہندو قوم کا المیہ ہے۔ اس کے مقابلے میں قائد اعظم کا طرز عمل قطعی مختلف تھا۔ وہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مساوات اور برابری پر یقین رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ممتاز حسین رقم طراز ہیں:

”تمام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے، مجھے اس کا اندازہ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انھیں دیکھتے ہی صفوں کی صفیں خالی کر دیں، تاکہ وہ سب سے آگے کی صف میں بیٹھ سکیں۔ انھوں نے آخری صف میں ہی بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں، کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔۔۔ ان کا ارشاد تھا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں، جو کسی فرقے کے لیے مخصوص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔“ (۴)

اس واقعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائد اعظم نہ صرف انسانی مساوات کے سختی سے قائل تھے بل کہ اصول پسند بھی تھے۔ انھوں نے لوگوں کے اس قدر عزت و احترام کے باوجود وہیں ٹھہرنا پسند کیا، جہاں قطار کے مطابق ان کی جگہ بنتی تھی۔ ایسا حوصلہ بہت کم انسانوں میں ہوتا ہے اور خاص طور سے ایسے انسانوں میں، جنہیں معاشرے میں مقام و مرتبہ بھی حاصل ہو۔

اُن کی اصول پسندی کے تو کئی واقعات اُن کے زمانہ و کالت میں بھی موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اصول پسندی کو سیاست میں آنے کے بعد اختیار نہیں کیا، یہ ان کی سرشت میں شامل تھی۔ اس میں کسی طرح تصنع یا بناوٹ شامل نہیں تھی۔ ان کی اصول پسندی کے حوالے سے ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو، جسے مطلوب حسین سید نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے:

”ایک مرتبہ بمبئی کے ایک تاجر عبدالکریم نے قائد اعظم کو ایک مقدمے میں وکیل مقرر کرنا چاہا۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ میری فیس پانچ صد روپے روزانہ ہے۔ عبدالکریم نے کہا کہ میں اتنی بھاری فیس ادا کرنے کا متحمل نہیں، کچھ کم کریں۔ قائد اعظم نے انکار کر دیا۔ عبدالکریم نے قائد اعظم کے سامنے پانچ ہزار روپے کی رقم رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ کی پانچ صد روپے روزانہ کی فیس منظور ہے، لیکن سر دست میرے پاس یہی رقم ہے، آپ مقدمے کی پیروی شروع کر دیں، باقی رقم میں مقدمہ کی پیروی کے دوران یا اختتام پر ادا کر دوں گا۔ قائد اعظم نے تین دن میں مقدمہ کی پیروی کر کے مقدمہ جیت لیا اور عبدالکریم سے صرف تین دن کی فیس پندرہ سو روپے وصول کر کے باقی رقم اسے واپس لوٹا دی۔“ (۵)

قائد اعظم ایک پر خلوص رہنما تھے۔ انہوں نے اپنے حلقے میں بھی ایسی شخصیات کو پسند کیا، جن کے اخلاص پر انھیں اعتماد تھا۔ انہوں نے کانگریس سے ایسے لوگوں کو لینے سے انکار کر دیا، جو کسی لالچ یا طمع کے تحت مسلم لیگ میں آنے کو تیار تھے، انھیں اس حوالے سے خود مسلم لیگ کے اندر سے بعض تجاویز دی گئیں، بل کہ اصرار بھی کیا گیا مگر وہ نہ مانے۔ یہاں تک کہ انھوں نے شملہ کے ایک سرگرم مسلم لیگی کارکن پیر زادہ محمد ذکاء اللہ کی ایسی ہی تجویز کو اس وقت مسترد کر دیا، جب مسلم لیگ ابھی ابتدائی دور میں تھی اور اس میں کارکنوں کی تعداد بہت کم تھی۔ (۶)

قائد اعظم کی ثابت قدمی کا یہ عالم تھا کہ وہ جب تک کانگریس میں رہے، ہندو مسلم اتحاد کے لیے تنگ و تناز کرتے رہے، پورے اخلاص کے ساتھ اپنے مقصد پر کاربند رہے، مگر جب انھیں یقین ہو گیا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا

چاہتی ہے تو پھر انھوں نے مسلمانوں کے لیے آزادی کے حصول کی بے مثال جدوجہد کی۔ کانگریس کی طرف سے انھیں حصول پاکستان کے راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کیا جتن کیے گئے، لالچ دیے گئے، مگر انھوں نے کسی بات کی پروا نہ کی اور اپنے عزم و استقلال سے برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو تحریک پاکستان میں بدل دیا اور بالآخر انہی کی قیادت میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ اس ضمن میں روزنامہ ”نوائے وقت“ کے مستقل کالم ”سرِ رائے“ سے اقتباس دیکھیے:

آزاد خالصتان کے لیے جدوجہد کرنے والی سکھوں کی عالمی تنظیم
برخالصہ انٹرنیشنل نے یوم قائد اعظم کے حوالے سے پاکستانیوں کو
خصوصی پیغام بھیجا ہے، جس میں قائد اعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کو
شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر سکھوں کو
بھی قائد اعظم جیسا رہنما مل جاتا تو آج ان کا شمار بھی دنیا کی آزاد
اقوام میں ہوتا۔“ (۷)

”سر رائے“ نگار مزید لکھتے ہیں:

”مسز سر وجنی نائیڈو، جسے ہندو جاتی نے ”بلبل ہند“ کا خطاب
دے رکھا تھا، قائد اعظم کے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر مسلم لیگ
کے پاس نہر وادرا گاندھی جیسے ہزاروں لیڈر ہوتے تو وہ بھی پاکستان
بنانے میں کامیاب نہ ہوتے، لیکن کانگریس کے پاس اگر ایک بھی
جناح ہوتا تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔“ (۸)

قائد اعظم کی قائدانہ صلاحیت پر تو شاید کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ ان کا شدید سے شدید
مخالف بھی آج تک ان کی دیانت داری، راست گوئی اور جرأت مندانہ قیادت پر انگشت نمائی نہیں کر
سکا۔ ان کے سوانح نگاروں نے بھی ان کی محنت، دیانت اور جرأت کو خاص طور سے موضوع بنایا ہے اور
ان کے اعلیٰ اوصاف پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ ایک صاف گو مسلمان تھے جو ان کی زبان پر
ہوتا، وہی ان کے دل میں ہوتا اور ان کے عمل سے بھی جھلکتا۔ ان کے مقابلے میں گاندھی سیاسی چالیں
آزمانے میں مہارت رکھتے تھے، جو کہتے، عمل اُس سے مختلف ہوتا اور دل کی بات تو وہ زبان پر لاتے ہی
نہ تھے۔ قائد اعظم ان کے اس سیاسی طرز عمل سے خوب واقف تھے۔ اُن کی رائے تھی:

”حضرت قائد اعظم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، جالندھر کے
اجلاس میں جو ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوا تھا، فرمایا: مشکل یہ ہے کہ گاندھی
جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا
درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔“ (۹)

گانڈھی جی کے قول و عمل میں یہ تضاد ہمیں کئی مقامات پر نظر آتا ہے۔ وہ ایک طرف برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج میں مصروف تھے تو دوسری جانب وائسرائے سے راہ و رسم بڑھا رہے تھے اور اس کام پر انھوں نے کانگریس کے بعض رہنماؤں کو باقاعدہ طور پر لگا رکھا تھا۔ پھر پٹھانوں کے ساتھ ان کا رویہ ملاحظہ کیجیے: وہ ایک طرف خان عبدالغفار خان سے کہہ رہے تھے کہ پٹھانوں سے چاقو چھین لو، تاکہ تشدد کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ مگر دوسری جانب کلکتہ کی خواتین کو تاکید کر رہے تھے کہ وہ پستول وغیرہ اپنے پاس رکھیں اور گولی چلانا سیکھیں۔ تقسیم کے وقت مشرقی پنجاب میں جو آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی اور جس میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، اس کے پیچھے بھی گانڈھی جی اور ان کے ہندو قائدین کی سیاسی چالیں کا فرما تھیں۔ یہ وہ زخم ہے جو ستر سال گزرنے کے باوجود مندمل نہیں ہوا۔

قائد اعظم ۱۹۱۶ء آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ انھیں مسلم لیگ میں لانے والوں میں مولانا محمد علی جوہر اور سیدوزیر حسن پیش پیش تھے۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے باوجود وہ کانگریس کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ کانگریس سے وابستہ رہ چکے تھے اور ابھی تک کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا تھا، جس پر وہ افسردہ یا رنجیدہ ہوتے۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کو باہم قریب لانے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں دونوں جماعتوں کے مابین ”بیفاق لکھنؤ“ ہوا، مگر جب بعد میں کانگریس کے اقدام سے یہ عیاں ہوا کہ وہ صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت کے طور پر سرگرم عمل ہے تو قائد اعظم کے تصورات بھی بدل گئے۔ ان کا تصور آزادی واضح ہوتا گیا، جو دراصل تصور پاکستان تھا۔ قائد اعظم جب مسلم لیگ میں دوبارہ سرگرم عمل ہوئے تو آپ کے سامنے منزل کا تصور اظہار من الشمس تھا، علامہ اقبال کے خطوط بنام جناح اور پھر اقبال کے خطبہ الہ آباد نے مسلمانان ہند کو ان کی منزل مقصود کی راہ دکھا دی تھی۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں آپ اور اقبال، دونوں مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر شریک تھے۔ ہمایوں ادیب لکھتے ہیں:

”۲۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں گروپوں نے

محمد علی جناح کی صورت میں متحد ہو جانے پر رضامندی کا اظہار کر

دیا اور مسٹر جناح کو متحدہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔“ (۱۰)

۱۹۴۰ء تک آتے آتے آپ نے اپنے تئیں اور عزم و استقلال کو مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں منتقل کر دیا تھا۔ آپ کی گفت گو ہمیشہ مصلحت اور ”اگر مگر“ سے پاک ہوتی تھی۔ آپ جو کہتے، پوری سچائی اور صاف گوئی سے بیان کرتے۔ آپ انگریزی میں بھی تقریر کرتے تو مسلمانوں کو یقین ہوتا کہ آپ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ تھا عوام کا آپ پر اعتماد۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۰ء کو آپ نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کیا۔

”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا مطمح نظر کیا ہے؟ بات بالکل صاف ہے، برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں اور ہندوستان دونوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی اور کانگریس کو کرنے دیں گے، ہم دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔“ (۱۱)

جس طرح قائد اعظم کا تصور آزادی واضح تھا، اسی طرح اردو زبان کے حوالے سے بھی اُن کے خیالات ہر طرح کیے تذبذب اور مصلحت سے ماورا تھے۔ قائد اعظم اگرچہ اردو کم جانتے تھے، لیکن جس قدر جانتے تھے، کوشش کرتے کہ اپنا ماضی الضمیر اردو میں بیان کریں۔ انگریزی کے بعد دوسری زبان اُن کے لبوں پر رہی، وہ اردو تھی۔ ایسے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے بنگال کے بعض علاقوں میں بھی اردو میں تقاریر کیں، جہاں بنگالی سمجھنے والے زیادہ تھے، یا کسی حد تک انگریزی سمجھنے والے بھی موجود تھے۔ اس کے برعکس گاندھی ہندی زبان کا فروغ چاہتے تھے، مگر قائد اعظم کی اولین ترجیح اردو تھی، کیوں کہ وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان کا درجہ دیتے تھے اور یہ بات اُن کے ذہن میں راسخ تھی کہ جس طرح برصغیر میں بسنے والی مختلف قومیں اپنے واحد مذہب اسلام کی وجہ سے متحد ہیں، اُسی طرح اردو زبان یہاں کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور جب مختلف النوع لوگوں کا مذہب اور زبان ایک ہو جائیں تو وہ ایک قوم بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں قائد اعظم کا ایہ ارشاد نقل کیا ہے

”میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔“ (۱۲)

گویا قائد اعظم کی زندگی میں قیام پاکستان سے پہلے ہی قائد نے منادی کرا دی تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگا، لیکن قیام پاکستان کے بعد اس اعلان کی تکمیل میں آج بھی کتنے ہی بیرہ حائل ہیں یا حائل کر دیے گئے ہیں، یہ امر قابل افسوس نہیں تو اور کیا ہے!

قائد اعظم جب کانگریس میں تھے، ہندو مسلم اتحاد کے لیے مخلصانہ مساعی کرتے رہے، مگر جب مسلم لیگ میں آگئے تو پھر بھی ان کی کوشش تھی کہ اپنے اپنے الگ الگ منہبائے مقصود کے باوجود دونوں قوموں کے مابین مفاہمت کی فضا قائم ہو۔ ہندو مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں اور مسلمان ہندوؤں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں، چنانچہ انھوں نے ہندو مسلم عدم تشدد کے لیے ہمیشہ اپنے اصولی موقف کی پاس داری کی اور یہ بات کانگریس قیادت کو بھی یاد کرتے رہے۔ ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ تحریری طور پر ہندو مسلم سمجھوتہ وجود میں آئے تاکہ مستقبل میں دونوں قوموں کے درمیان کسی انتشار یا

فساد کی فضا پیدا نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قائد اعظم نے گاندھی سے ملاقاتیں بھی کیں۔ مگر چوں کہ گاندھی کے دل میں کوئی معاملہ موجود تھا، وہ کانگریس کی جانب سے ایسے کسی سمجھوتے کے لیے پس و پیش سے کام لیتے رہے اور قائد اعظم سے کہا کہ میں ہندوؤں یا کانگریس کی طرف سے نہیں، اپنی ذاتی حیثیت میں کچھ کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ بات قائد کے لیے باعث اطمینان نہ تھی، لہذا انھوں نے گاندھی کے اس طرز عمل پر اپنے رد عمل کا اظہار ایک خط میں کیا، لکھتے ہیں:

”محترم جناب گاندھی! ہماری کل ۹ ستمبر کی گفت گو کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی انفرادی حیثیت میں مجھ سے ہندو مسلم سمجھوتہ پر بات چیت کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اور یہ کہ آپ نہ تو کانگریس یا ہندوؤں کے ایما پر آئے ہیں، نہ ہی آپ کو کوئی نمائندہ حیثیت یا اختیار ہے۔ حتیٰ کہ آپ ایسا کرنے کے مجاز بھی نہیں۔ قدرتی طور پر میں نے آپ سے کہا تھا کہ فریق ثانی کی طرف سے کوئی نمائندہ حیثیت کا حامل شخص ہونا چاہیے، جس کے ساتھ میں بات چیت کر سکوں اور اگر ممکن ہو تو ہندو مسلم مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ بھی طے کر لوں، لیکن جو حیثیت آپ نے اختیار کی ہے اس کی پہلے کوئی مثال بھی نہیں۔“ (۱۳)

گاندھی کے نام قائد اعظم نے یہ خط ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو لکھا، جس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ قائد اعظم ہندو قیادت کی مسلم دشمنی کے خطرات کو محسوس کرتے تھے اور کسی ممکنہ فساد سے مسلمانوں کو بچانا چاہتے تھے، لیکن گاندھی اس کے لیے تیار نہ تھے جس کا نتیجہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی صورت میں برآمد ہوا۔

قائد اعظم اور گاندھی کے مذہبی و سیاسی نظریات میں نہ صرف فرق تھا، بل کہ دونوں میں ایک معکوس تعلق تھا۔ دونوں کی منزلیں تو جدا تھیں ہی، دونوں کے راستے بھی جدا تھے۔ قائد اعظم کو گاندھی کے بعض اقدام سے شدید اختلاف تھا اور وہ ان پر اپنا رد عمل بھی دیتے تھے، لیکن انھوں نے گاندھی کے لیے کبھی طعن و تشنیع کی زبان استعمال نہیں کی نہ ہی ان کی ذاتی شخصیت پر کبھی کوئی حملہ کیا، ہمیشہ اعتدال اور توازن کو برقرار رکھا۔ ایم اے حسین نے قائد اعظم کے اس مثبت رویے پر یوں خامہ فرسائی کی ہے:

”۷ جون ۱۹۳۱ء کو کچھ مسلمان طالب علموں کی ملاقات سینٹ جان کالج میں چائے پر ہوئی اور یہاں ذرا بے تکلفی سے باتیں ہوئیں۔ اس ملاقات میں جناح صاحب نے ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ شبے ظاہر کیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے

کہ اس دن جناح صاحب نے گاندھی جی کا ذکر برابر ”مہاتما جی“ کہہ کر کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آخر ہندو ہیں، اس لیے ان کے لیے ہندوؤں کا مفاد باقی ہر مفاد سے بڑھ کر ہے۔“ (۱۴)

قائد اعظم ایک قدآور شخصیت تھے، ایسی شخصیات کے اتفاق اور اختلافات کی گنجائش ہر کسی کے لیے موجود ہوتی ہے، جہاں ایسی شخصیات کے مداح ہوتے ہیں، وہاں ناقد بھی موجود ہوتے ہیں۔ یوں بھی کوئی شخصیت سراپا حسن و خوبی نہیں ہوتی، کمیاں اور کوتاہیاں بھی انسانی وجود کا حصہ ہیں، مگر ہمارے ہاں تنقیص نگاری یا رجحان کچھ زیادہ ہی ہے۔ تحریک پاکستان کے ایک اہم رہنما بہادر یار جنگ نے ایک دل چسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب کو تحریک پاکستان کے قائدین کی عظیم خدمات کے باوجود ان میں خامیاں نظر آتی ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے ان کے خیالات پر براہیختہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا موقف انہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو، یہ خط انہوں نے حمید نظامی کے نام لکھا:

”مجھ سے لوگ اکثر شکایت کے انداز میں کہتے ہیں کہ ہندو اپنے ناقص کو بھی آسمان پر پہنچاتا ہے اور مسلمان اپنے کامل کی بھی ٹانگ کھینچتا ہے۔ میں اس میں مسلمان کا نقص نہیں، جس دیکھتا ہوں۔ ہندو کا ناقص بہر حال اس کی گائے، گڑگا، پھیل اور سنگ ہائے ناشر اسندہ سے اچھا ہے جو اس کے لیے معیار کمال ہے اور مسلمانوں کا کامل بھی مسلمانوں کے معیار کمال یعنی قرن اول کی قیادت پر پورا نہیں اترتا۔“ (۱۵)

قائد اعظم یقیناً ایک جامع شخصیت تھے۔ ان کے مقابلے میں گاندھی کو روایتی سیاست کا نمائندہ تو کہا جاسکتا ہے، مگر جس طرح قائد اعظم میں سچائی اور صاف گوئی تھی، اس کی مثال ہماری سیاسی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ قائد اعظم روایتی سیاست کی مکاریوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے حصول پاکستان کے لیے عظیم الشان جدوجہد کی اور مسلم لیگ کو برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنا دیا، لیکن اس ساری جدوجہد میں انہوں نے ملکی قوانین کو ملحوظ خاطر رکھا، گاندھی کے لیے ملکی قوانین کو توڑ کر جیل جانا ایک اعزاز تھا، لیکن قائد اعظم کا طرز سیاست کا نگرانی قیادت سے قطعی مختلف تھا۔ اس امر کی شہادت اس عہد کی مختلف تحریروں میں ملتی ہے۔ قائد اعظم نے پاکستان کا مقدمہ عوامی اور آئینی، دونوں سطح پر نہایت کامیابی سے پیش کیا۔ عوامی سطح پر انھیں اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی کہ پورے برصغیر میں ہر مسلمان بچے بوڑھے، جوان، مرد و زن کی زبان پر پاکستان کا نام تھا اور ”بن کے رہے گا پاکستان“ کا نعرہ گلی گلی، قریہ قریہ، بہتی بہتی، شہر شہر گونج رہا تھا۔ اسی طرح آئینی اور قانونی سطح پر بھی انہوں نے حکومت برطانیہ کو اپنے اس موقف پر قائل کر لیا کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں، انڈین

نیشنل کانگریس کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔ کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ ہندوستان میں رہنے والی تمام قوموں کی نمائندہ جماعت ہے، درست نہیں۔ اس پر ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ کو برطانوی وزیراعظم سروسٹن چرچل نے اعلان کیا کہ کانگریس سارے ہندوستان کی نمائندہ نہیں۔۔۔ کانگریس سے باہر اس کے خلاف صف آرا نو کروڑ مسلمان بھی ہیں، جنہیں اپنے معاملات کے بارے میں اظہار خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ علاوہ ازیں کانگریس پس ماندہ طبقات سکھوں اور عیسائیوں کی ترجمان و نمائندہ ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ (۱۶) قائداعظم کی بے مثال شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے میاں بشیر احمد نے لکھا ہے:

”جس طرح اتاترک نے ترکیہ کو سنبھال لیا، اسی طرح قائداعظم نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے آزادی کی راہ کھول دی۔ ہر ملک کے حالات جدا اور ہر رہنما کا کام بھی جدا گانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ قائداعظم نے جو کام کیا، وہ اپنی جگہ لازوال تھا اور اس کے اثرات مدتوں تک اسلامی دنیا میں محسوس ہوتے رہیں گے۔“ (۱۷)

قائداعظم اور گاندھی کے تقابلی مطالعے سے قائداعظم کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آئی ہے۔ واقعات تحریر کو نہ حرف مزید دل چسپ بناتے ہیں، بل کہ شواہد کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں پروفیسر مظفر مرزا نے واقعات کی جمع آوری اور ان کا بیان مہارت کا متقاضی ہے۔ اشعار اور نظموں کے پرچل استعمال سے قاری کی رغبت کو افزوں کیا ہے۔ ان میں اقبال، اثر صہبائی اور قتیل شفائی کی منظومات خاص طور سے اہم ہیں۔ قائداعظم اور گاندھی کی شخصیات کے تقابل میں دونوں کے شخصی خصائص کے پہلو بہ پہلو تحریک خلافت، کابینہ مشن پلان، تحریک رسول نافرمانی، مونٹ بیٹن کی بہ طور وائس رے ہند آمد، قرداد پاکستان کی منظوری، کانگریس کا رد عمل، گاندھی کا قتل، سردار پٹیل پر الزام اور دیگر ایسے اہم تاریخی واقعات کو اہم حیثیت حاصل ہے، جن میں دونوں رہنماؤں کے طرز عمل سامنے آتے ہیں۔ قائداعظم اور گاندھی کی شخصیتوں، ان کی سیاسی زندگی اور قائدانہ صلاحیتوں کے موازنہ سے قائداعظم کے بارے میں ایسے شوک و شبہات بھی دور ہو جاتے ہیں، جو ان کے مخالفین کے پیدا کردہ ہیں: قائداعظم کی سیاسی بصرت کا اس سے بڑا کمال کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے مکمل منظر نامے کو برسوں پہلے بھانپ لیا تھا، وہ ہندو قیادت کے اس خواب کو جان گئے تھے، جس کی تعبیر وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ وہ ہمارے اُس عہد کے بیش تر مذہبی و سیاسی رہنماؤں کی طرح کانگریسی قیادت کی چکنی چڑی باتوں میں نہیں آئے، جو سیاسی بصیرت سے محروم تھے موجودہ بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کا منظر نامے محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت پر دال ہے۔ قائداعظم نے ہندو اکثریت کا بت پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ایک ایسے خطہ زمین سے بہرہ مند کیا، جہاں حکومت، سیاست، معیشت،

نور تحقیق (جلد: ۲، شماره: ۸) شعبہ اُردو، لاہور گزیشن یونیورسٹی، لاہور
معاشرت، ثقافت، غرض ہر شعبہ زندگی میں انھیں اولیت حاصل ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ مظفر مرزا، پروفیسر محمد، قائد اعظم اور گاندھی، لاہور: بزم اقبال، مارچ ۲۰۰۸ء، ص: ۱۱
- ۲۔ ایضاً
- ۳۔ ایضاً، ص: ۱۲
- ۴۔ ممتاز حسن، مضمون: سالانہ قوم، مشمولہ: نقوش قائد اعظم، مرتبہ: پروفیسر رحیم بخش شاہین، ص: ۱۴
- ۵۔ مطلوب حسین سید، مضمون: ایک مردِ خود آگاہ، مطبوعہ: اقراء، قائد اعظم نمبر، جون ۱۹۷۶ء، ص: ۷۴
- ۶۔ ممتاز حسن، سالانہ قوم، نقوش قائد اعظم، مرتبہ: پروفیسر رحیم بخش شاہین، ص: ۱۱-۱۰
- ۷۔ کالم نگار، سررا ہے، مطبوعہ: نوائے وقت، روزنامہ، لاہور، ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء
- ۸۔ ایضاً
- ۹۔ مظفر مرزا، قائد اعظم اور گاندھی، ص: ۱۵
- ۱۰۔ ہمایوں ادیب، قائد اعظم محمد علی جناح، ماہ و سال کے آئینے میں، لاہور: نظریہ پاکستان ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص: ۷۷
- ۱۱۔ سراج نظامی، مضمون: قائد اعظم، مشمولہ: نقوش قائد اعظم، بحوالہ: مظفر مرزا، قائد اعظم اور گاندھی، ص: ۵۰
- ۱۲۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، قائد اعظم اور اردو، مشمولہ: نقوش قائد اعظم، بحوالہ: مظفر مرزا، قائد اعظم اور گاندھی، ص: ۳۳
- ۱۳۔ مظفر مرزا، قائد اعظم اور گاندھی، ص: ۲۵
- ۱۴۔ ایم اے حسین، مضمون: ایک نئے دور کا آغاز، مطبوعہ: ماڈنو، کراچی، نومبر ۱۹۴۸ء، ص: ۵۱
- ۱۵۔ بہادر یار جنگ، مکتبہ بہادر یار جنگ، کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ص: ۵۲۸
- ۱۶۔ سرونسن چرچل، بحوالہ: ہمایوں ادیب، قائد اعظم: ماہ و سال کے آئینے میں، ص: ۱۲۳
- ۱۷۔ بشیر احمد، میاں، مضمون: اسلامی دنیا کے دورِ انہما، مطبوعہ: ماڈنو، قائد اعظم نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۵۰ء، ص: ۲۰